

## ہم پاکستانی.....؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

آج آپ سے ذرا ہلکی پھلکی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے اور اس حوالے سے مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ آج سے کوئی تینتیس برس قبل جب روس صحیح معنوں میں ایک سپر پاور تھا اور اسے یو ایس ایس آر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا تو اسلام آباد کی ایک کافی پارٹی (Coffee Party) میں روسی سفیر نے اپنا یہ تجربہ سنا کر ہمیں خوشگوار حیرت میں ڈال دیا۔ اس دور میں موٹروے نہیں ہوتی تھی اس لئے لاہور آنے کے لئے جی ٹی روڈ پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ روسی سفیر نے بتایا کہ میں اپنی ”روس ساختہ“ کار پر اسلام آباد سے لاہور جا رہا تھا کہ گجرات سے گزرتے ہوئے اچانک کار بند ہو گئی۔ میرے ڈرائیور نے ہزار کوشش کی لیکن کار سٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ میں کار سے نیچے اتر کر سڑک کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور ڈرائیور کا کار پونٹ اٹھا کر نقص سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے دو تین بار یہ خیال آیا کہ کیوں نہ کسی ورکشاپ سے مکینک کو بلا یا جائے لیکن ہر بار یہ سوچ کر خیال کو جھٹک دیتا کہ یہاں کوئی بھی روسی جینالوجی کو نہیں سمجھتا اس لئے مسئلہ مزید بگڑ جائے گا۔ میں خاصی دیر سے سڑک کے کنارے پریشان کھڑا تھا اور ڈرائیور کی تمام کوششیں ناکام ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع ورکشاپ سے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک مکینک اوزار اٹھائے ہماری جانب آ رہا ہے۔ اسے شاید ہماری بے بسی پر رحم آ گیا تھا۔ وہ آیا اس نے مجھے سلام کیا اور ڈرائیور کو ایک طرف ہٹا کر کار کے انجن کو دو چار ہاتھ لگائے اور پھر ڈرائیور سے کہا کہ اب سٹارٹ کرو۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پہلے ہی سلف پر گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔ میں نے خوش ہو کر اسے انعام دینا چاہا تو وہ مسکرا کر یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ یہ واقعہ سنا کر روسی سفیر نے کہا کہ میں بہت سے ملک میں چھوٹے بڑے درجے کی سفارت کاری کر چکا ہوں اور دو سال سے پاکستان میں ہوں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ پاکستانی قوم نہایت باصلاحیت ہے، قدرت نے اسے ذہانت اور معاملہ فہمی سے نوازا ہے اور اگر اس قوم کی صلاحیتوں کو تعلیم سے آراستہ کر کے تعمیری منصوبوں کے لئے استعمال کیا جائے تو پاکستان دو دہائیوں کے اندر اندر ایک بڑی قوت بن سکتا ہے۔ خیر اب تو اس واقعے کو بھی تین سے زیادہ دہائیاں گزر چکی ہیں اور پر نالہ ہیں پر موجود ہے۔

1970-71ء میں مجھے ایک کینیڈین گورے سے ملنے کا اتفاق ہوا جو بائنا فیکٹری لاہور میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ پاکستانی بڑے باصلاحیت اور ذہین لوگ ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ ہماری فیکٹری میں ایک نیم خواندہ شخص ہمارا چیف انجینئر ہے اور مشینوں کے مزاج کو اس قدر سمجھتا ہے کہ کینیڈا میں پڑھے لکھے انجینئرز بھی اتنا نہیں سمجھتے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ شخص ضیاء الدین بٹ میاں نواز شریف کے قریبی ساتھی سکیل ضیاء بٹ کے والد گرامی تھے اور اب تو ان کا پوتا مسلم لیگ (ن) کے ٹکٹ پر ایم پی اے بن چکا ہے۔ سکیل ضیاء بٹ کامیاب نواز شریف کی وزارت اعلیٰ کے دور میں لاہور میں بڑا ”جھکا“ اور بد بہ تھا۔

میں 1989ء میں امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں تھا۔ اس دور میں غیر ملکی فون کالیں بڑی مہنگی ہوتی تھیں۔ ایک شام ایک پاکستانی شناسا کے گھر کھانے پر مدعو تھا کہ اس نے مجھے مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور میری فیملی سے بات کروانے کی آفر کی۔ میں نے یہ سوچ کر بات ٹال دی کہ اس مہربان کا فون بل بڑھا نا مناسب نہیں۔ وہ بھی سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ آپ بل سے پریشان نہ ہوں۔ ہمارے ایک پاکستانی دوست نے ایک ایسا فون نما آلہ ایجاد کر لیا ہے جس کا براہ راست تعلق سیٹلائٹ سے قائم ہو جاتا ہے اور ہم دنیا بھر میں مفت کالوں کا مزہ لیتے ہیں۔ وہ ہمیں یہ آلہ دس ڈالر کر کے پر رات بھر کے لئے دیتا ہے شرط صرف یہ ہے کہ اسے خفیہ رکھنا ہوتا ہے۔ انہی دنوں میں شکاگو گیا تو ایک دوست سیرز ٹاور کی بلندیوں کی سیر کروانے لے گئے۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ سیرز ٹاور دنیا کا دوسرا بلند ترین ٹاور ہے۔ لفٹ پر سوار ہونے سے قبل میں نے ٹاور کے سنگ بنیاد پر نظر ڈالی تو میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ اس ٹاور کے ڈیزائن کرنے والوں میں ایک پاکستانی بھی شامل تھا۔ دانشمندانہ انداز میں سن کر حد درجہ مسرت ہوئی کہ امریکہ کے اہم اور حساس خلائی پروگرام ”ناسا“ میں پاکستانی سائنس دانوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسری بار وہاں گیا تو پتہ چلا کہ امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تقریباً پانچ ہزار پاکستانی طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ میں نے کئی یونیورسٹیاں وزٹ کیں اور مجھے ہر جگہ یہ بتایا گیا کہ ایشین (Asian) طلبہ (چینی، جاپانی، پاکستانی، انڈین، بنگلہ دیشی) ہر یونیورسٹی میں چھائے ہوئے ہیں اور مجموعی طور پر ان کی تعلیمی کارکردگی امریکی طلبہ سے کہیں بہتر ہے۔ لندن جائیں تو یہ سن اور دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے پسماندہ دیہاتوں کے کچھ حضرات وہاں محنت اور لگن سے ترقی کرتے کرتے ہاؤس آف لارڈز تک پہنچ گئے ہیں ایک صاحب نائب وزیر بھی بن چکے ہیں اور کئی پاکستانی میسر اور دوسرے اہم عہدوں پر فائز ہیں یا فائز رہے ہیں۔ وہ شاید اگر پاکستان میں رہتے تو ان بلندیوں پر نہ پہنچ سکتے کیونکہ صلاحیت کی نشوونما اور اسے پروان چڑھانے کے لئے جس نظام اور ماحول کی ضرورت ہے وہ فی الحال ہمارے ہاں موجود نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ ہمارے پاکستانی حضرات فراڈ اور دھوکہ دہی میں بھی اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ اس قدر ہوشیاری اور چال کدستی سے واردات کرتے ہیں کہ ان کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے۔ ایسے مواقع پر میں سوچتا ہی رہ جاتا ہوں کہ اسے کاش! ہم اپنی ان صلاحیتوں کو تعمیری سرگرمیوں کے لئے استعمال کریں۔ پرسوں مجھے موبائل پر ایک نہایت معصوم سا پیغام ملا کہ آپ کی سم کا انعام نکلا ہے۔ اس نمبر پر ایس ایم ایس کریں اور اپنا انعام حاصل کریں۔ میں نے ایس ایم ایس کیا تو پیغام ملا شکریہ آپ کے اکاؤنٹ سے اتنی رقم اس نمبر کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی گئی ہے۔ چند ماہ قبل نیویارک کے ایک اخبار میں ایک پاکستانی کی ماہرانہ کارکردگی کی داد دی گئی تھی جس نے نہایت ہوشیاری سے بنکوں سے لاکھوں ڈالر نکلوا کر اپنے مہربانوں کو دوسرے ممالک میں بھجوا دیے تھے۔ ہمارے بہت سے شہروں میں ایسے کارگر موجود ہیں جنہیں اگر آپ کوئی غیر ملکی پزہ دے دیں تو وہ اس جیسا پزہ اس طرح سے بنا کر دیں گے کہ نقلی پر اصلی کا گمان ہوگا۔ بقول ایک امریکی پروفیسر کے پاکستانی اتنی باصلاحیت قوم ہیں کہ انہوں نے ادھر ادھر سے نقل مار کر اور خفیہ ذرائع استعمال کر کے اپنے آپ کو ایک معتبر ایسی قوت بنا لیا ہے۔

یہ موضوع طویل ہے اور بہت سے واقعات اور مشاہدات میرے ذہن پر دستک دے رہے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستانی قوم کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتوں اور ذہنی و تخلیقی قوت سے نوازا ہے لیکن ملک کا نظام اور ماحول انہیں پروان نہیں چڑھنے دیتا۔ چنانچہ یہی پاکستانی جب ملک سے باہر جاتا ہے تو اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتا ہے مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے — یعنی کام، محنت اور دیانت میں بھی نام پیدا کرتا ہے اور فراڈ، دھوکہ دہی اور دیگر وارداتوں کے حوالے سے بھی شہرت پاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح ملک میں ایسا ماحول پیدا کریں، ایسا نظام لائیں اور ایسے حالات پیدا کریں جن میں قوم کی صلاحیتیں پروان چڑھ سکیں اور ان صلاحیتوں کو ملکی و قومی ترقی کے لئے استعمال کیا جاسکے۔ یہ کام صرف حکومت کا نہیں، یہ ذمہ داری سارے معاشرے کی ہے اس لئے اس مقصد کو صرف اسی صورت حاصل کیا جاسکتا ہے جب حکومت اور سول سوسائٹی مل کر حکمت عملی وضع کریں اور پھر مل کر جدوجہد کریں۔ میرے نزدیک اس سلسلے کی پہلی کڑی معیاری تعلیم کی فراوانی، منصفانہ معاشرے کی تشکیل، ترقی کے یکساں مواقع، میرٹ اور قانون کی بالادستی ہے کیونکہ جب تک ملک کے ہر بچے کو معیاری اور مفت تعلیم دستیاب نہ ہو اور معاشرے میں میرٹ، انصاف اور قانون کی بالادستی نہ ہو اس وقت تک ملک میں صلاحیتوں کے پروان چڑھنے اور نکھرنے کے لئے سازگار ماحول پیدا نہیں ہوتا۔ غربت بلاشبہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے لیکن غربت کے باوجود سازگار ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے اور پھر اپنی آئندہ نسلوں کی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر ہی ہم غربت کا بھی علاج کر سکتے ہیں کیونکہ غربت کا مستقل علاج غیر ملکی امداد یا حکومتی امداد سے نہیں کیا جاسکتا۔ بقول شاعر

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) No Comments »

**Ya Kis Ki Jang Hai?...**

September 25th, 2008



## یہ کس کی جنگ ہے؟ کنفیوژن کیوں؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

اگرچہ اسلام آباد میں خود کش حملے کے سانحے کے بعد وزیراعظم کہہ چکے ہیں کہ ”یہ ہماری جنگ ہے لیکن اس کے باوجود ابھی تک فانا، سوات اور سرحدی علاقوں میں جاری آرمی آپریشن کے بارے میں خاصا کنفیوژن پایا جاتا ہے اور رائے عامہ اس حوالے سے کی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کنفیوژن کو سمجھنے کے لئے اس مسئلے کا اپنے پس منظر میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ میں دفاعی تجزیہ نگار ہوں نہ سرحدی علاقوں کے معاملات کا ماہر، اس لئے میں اس مسئلے پر اپنے مشاہدے کے حوالے سے روشنی ڈالوں گا۔

اگرچہ ہمارے ملک میں رائے عامہ پول (Public opinion polls) زیادہ سائنٹفک اور قابل اعتبار نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود رائے عامہ کے یہ سروے لوگوں کے رجحان اور جھکاؤ کا اندازہ لگانے میں خاصے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک رائے عامہ کے سروے کے مطابق صرف 48 فیصد پاکستانی سرحدی علاقوں میں آرمی ایکشن کی حمایت کرتے ہیں اس لئے تجزیہ نگاروں کی یہ توثیق کہ ابھی تک شدت پسندوں، پاکستانی طالبان اور جنگجوؤں کے خلاف جنگ کو پاکستانی قوم نے قبول (Own) نہیں کیا یا وہ اسے امریکہ کی جنگ سمجھتے ہیں، قابل فہم ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ اور بہت سے مسائل کی مانند ابھرا ہوا ہے اور اسے کبھی سلجھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ افغانستان میں طالبان کی حکومت کے عروج کے دور میں نہ صرف پاکستانی علماء بلکہ عوام کی بھی خاصی تعداد ان کے انداز حکومت سے بے حد متاثر تھی کیونکہ انہیں اس سے خلافت راشدہ کے دور کی خوشبو آتی تھی۔ طالبان نے جس طرح افغانستان میں امن بحال کیا، منشیات، چوری چکاری اور دوسری وارداتوں کو خاتمہ کیا، عوام کے لئے سستا اور فوری انصاف مہیا کیا، شرعی سزاؤں کے نظام کو جاری کیا، سادہ اور کم خرچ نظام حکومت قائم کیا اس سے پاکستان کے لوگوں میں خاصا جوش و خروش پایا جاتا تھا اور ایک عرصے تک تو پاکستانی محفلوں میں نہ صرف افغانستان کے نظام کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا بلکہ لوگ بڑے خلوص کے ساتھ اس تمنا اور آرزو کا اظہار کرتے تھے کہ اے کاش! ایسا نظام پاکستان میں بھی قائم ہو جائے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ طالبان کے قائم کردہ نظام کے کچھ پہلو قابل رشک تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اسی دور میں نواز شریف حکومت نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے وزیراعظم کو امیر المومنین بنانے کا ارادہ کیا تھا جس پر آج تک اعتراض کیا جاتا ہے اور وہ اعتراض بالکل درست اور بامعنی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس فیصلے کے پس پردہ بھی طالبان پر ”رشک“ جلوہ گر تھا۔ یہ شخص میرا اندازہ ہے کیونکہ اصل بات وہی معززین بتا سکتے ہیں جن کا اقتدار کی چار دیواری میں آنا جانا تھا یا جنہیں حکمرانوں کی قربت نصیب تھی۔ مختصر یہ ہے کہ پاکستانی عوام اور خاص طور پر مذہبی حلقوں میں طالبان کے لئے جو نرم گوشہ پیدا ہوا وہ آج تک موجود ہے۔

تاؤن ایون کے بعد جب امریکہ نے افغانستان سے اسامہ بن لادن مانگا تو اگر طالبان اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دیتے تو شاید صورتحال مختلف ہوتی لیکن جب طالبان نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مہمان کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تو تقریباً ساری دنیائے اسلام میں اس فیصلے کا گرجوئی سے استقبال کیا گیا حالانکہ لوگوں کو علم تھا کہ اس فیصلے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی اور امریکہ کی عسکری قوت کا بدست ہائی افغانستان کو پامال کر کے رکھ دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب امریکہ نے افغانستان پر حملے شروع کئے تو سارے اسلامی ممالک میں ان کے خلاف احتجاج کیا گیا اور امریکہ کے جھنڈے جلائے گئے۔ روس کے خلاف جہاد کے بعد جو بہت سے جہادی ہمارے فانا، وانا اور دوسرے سرحدی علاقوں میں آباد ہوئے اول تو ان کے طالبان اور افغانستان کے جہادیوں سے گہرے رشتے تھے، دوم جب وہ یہاں آباد ہو گئے اور ان میں سے اکثر نے پاکستانی خاندانوں میں شادیاں کر لیں تو انہیں سرحدی علاقوں کے مذہبی عوام نے قبول کر لیا۔ اگر تاؤن ایون کا سانحہ ظہور پذیر نہ ہوتا تو یہ لوگ پر امن زندگی گزار رہے تھے۔ افغانستان میں آتے جاتے رہتے تھے۔ پاکستان سے محبت کرتے تھے چنانچہ وہ پاکستان کے لئے کبھی بھی خطرہ نہ بنے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تو افغانستان سے مجاہدین کی ایک بڑی تعداد ہمارے سرحدی علاقوں میں آگئی جسے امریکی اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں اور ان کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ اسی دوران سوات، وانا اور ہمارے سرحدی علاقوں میں مذہبی تحریکوں نے زور پکڑا اور ان گنت مذہبی گروہوں نے شریعت نافذ کرنے کے لئے اپنے اپنے علاقوں پر قبضہ کر کے حکومت رٹ کزور کر دی۔ یہ کون سے گروہ تھے، ان کے قائدین کون اور اہداف کیا تھے، ان میں کہاں کہاں جرائم پیشہ افراد غالب آ گئے تھے اور کس طرح حکومت کبھی ان سے گفتگو اور معاہدے کر کے اور کبھی صرف نظر کر کے اپنے آپ کو کمزور کرتی رہی، یہ ایک طویل اور الگ بحث ہے لیکن ایک بات قابل غور ہے کہ ان میں شریعت نافذ کرنے والے گروہوں کو ہمارے اکثر مذہبی سیاستدانوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل تھی جو ان کے لئے چندے بھی اکٹھے کرتے تھے اور ان کے کارناموں کو اپنی تقاریر میں اچھا لیتے بھی تھے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ ہمارے اخبارات میں یہ بحث جاری تھی اور انہی صفحات میں یہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستان کے حصول کا مقصد اسلامی نظام کا نفاذ تھا اس لئے اگر ان علاقوں میں اسلامی شریعت نافذ کی جاتی ہے تو یہ حصول پاکستان کے تقاضوں کے عین مطابق ہے لیکن یہ باریک فرق نظروں سے اوجھل رہا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے نہ کہ مختلف گروہوں پر اور اگر مختلف گروہ اپنے اپنے علاقوں میں اپنی اپنی شریعت نافذ کر دیں تو ملک کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور حکومت کی رٹ کلائے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض علاقوں میں اسلام کی آڑ میں شدت پسندوں نے نہ صرف خواتین کا ناٹھ بند کر دیا، ان کا جینا دو بھر کر دیا بلکہ لڑکیوں کے سکولوں سے لے کر جموں اور سی ڈی ایز کی دکانوں تک ہر شے کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا جس سے نہ صرف اسلامی نظام کے تصور کو شدید نقصان پہنچا، بلکہ لڑکے برباد ہوئے بلکہ خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بلاشبہ تین صدیوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے تعلیم کو ضروری قرار دیا ہے لیکن ہمارے یہ شدت پسند لڑکیوں

کے سکولوں کو بموں سے اڑا کر نہ جانے کس اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور عالمی سطح پر پاکستان کے بارے میں کیا تاثر دے رہے ہیں۔

ان جہادیوں کے شدت پسند عناصر کے خلاف آرمی ایکشن کو قومی حمايت (ownership) حاصل نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تاثر ہے کہ دراصل یہ جنگ امریکہ کی جنگ ہے اور ہم ڈالروں کے لئے اپنے پاکستانیوں کو مار رہے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر بہت سے معصوم لوگ، عورتیں بچے اور بوڑھے بھی شہید ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب لوگوں کو معصوم شہریوں کی شہادت کی خبریں ملتی ہیں تو ان کے دل خون کے آنسو روتے ہیں۔ اگر پاکستان کے مختلف شہروں میں خودکش حملے اور بم دھماکے نہ ہوتے تو شاید ہمارے عوام میں اس خطرے کا احساس ہی پیدا نہ ہوتا کہ یہ جنگ ہمارے گھروں کی دہلیز تک پہنچ چکی ہے اور پاکستانی عوام کے قاتل وہ عناصر نہیں جن کے لئے وہ نرم گوشہ رکھتے ہیں اور اب اگر ہم ملک میں امن بحال کرنا چاہتے ہیں اور جمہوریت کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں تو خودکش حملوں اور بم دھماکوں کے پس پردہ عناصر کا صفایا کرنا پڑے گا ورنہ ہر روز پاکستان کا نائن الیون ہوتا رہے گا۔ اس ایک نقطے پر قوم کو متفق اور متحد کرنا ضروری ہے۔

اس ضمن میں قومی رائے عامہ تو بٹی ہی ہوئی ہے۔ خود ہماری فوج بھی اس حوالے سے مشکلات کا شکار ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ مجھ سے کئی فوجی افسران ملنے آئے جنہیں سرحدی علاقوں میں بھیجا جا رہا تھا یا وہ وہاں تعینات تھے۔ وہ سب کے سب ذہنی یکسوئی سے محروم تھے اور ان کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ کیا مسلمان بھائیوں پر گولی چلانا جائز ہے؟ اس سے اندازہ کیجئے کہ اس مسئلے پر قوم کس قدر انتشار کا شکار ہے اور اگر حکومت آرمی آپریشن کے لئے قوم کی مکمل حمایت چاہتی ہے تو اسے کس قدر بڑا چیلنج درپیش ہے۔ اس چیلنج کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان دشمن عناصر..... وہ لوگ جو پاکستان میں قتل عام کر کے ملک کو غیر مستحکم کرنا چاہتے ہیں اور وہ لوگ جن کے لئے عوام میں نرم گوشہ موجود ہے، ان کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے اور وطن دشمن عناصر کو مکمل طور پر بے نقاب کیا جائے تاکہ قوم اس نقطے پر متحد ہو کر حکومتی اقدام کی حمایت کرے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar Mehmood No Comments »

## Jang Bi Ho Aur Amen...

September 23rd, 2008



## جنگ بھی ہو اور امن رہے، کیا یہ ممکن ہے؟

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

اسلام آباد میں خودکش حملے کے مناظر ٹی وی پر دیکھتے ہوئے میں نیکی آنکھوں کے ساتھ مسلسل سوچتا رہا کہ یہ معصوم انسانی جانوں کے قاتل کب تک یونہی دندناتے رہیں گے، کب تک میرے وطن میں یوں ہی خون بہتا رہے گا اور لوگ خوف کے ہاتھوں پریشان رہیں گے اور کب تک پاکستان عالمی سطح پر بدنام ہوتا رہے گا۔ مجھے ان سوالوں کا جواب یہی ملتا تھا کہ ہم بحیثیت قوم حالات کے جبر کا شکار ہیں اس لئے یہ سلسلہ مستقبل قریب میں بھی رکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ کچھ روز قبل جب ہمارے حکمرانوں کے مشیران یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ ہم نے خودکش حملوں پر قابو پا لیا ہے، ہم نے بہت سے خودکش بمبار گرفتار کر لئے ہیں تو میں نے اسی کالم میں لکھا تھا کہ اے کاش! ایسا ہی ہو۔ تو کم از کم ایک ایک فرد یہی دعائیں مانگ رہا ہے لیکن ہم جن حالات کے جبر کا شکار ہیں، وہ یہاں امن قائم نہیں ہونے دیں گے اور موقع ملنے پر ضرور انتقامی کارروائیاں کریں گے۔ اس صورتحال سے منسلک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ درپیش چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جس اعلیٰ سطح کی قیادت کی ضرورت ہے بدقسمتی سے ہم اس وژن، بصیرت اور صلاحیت سے بھی محروم ہیں اس لئے مجھے یہ سلسلہ تھمتا یا ختم ہونا نظر نہیں ہوتا۔

سیدھی سی بات ہے کہ اس مسئلے کا براہ راست تعلق افغانستان کی صورتحال سے ہے اور جب تک افغانستان میں امن قائم نہیں ہوتا اس وقت تک ہمیں بھی اس کی سزا ملتی رہے گی۔ افغانستان میں امن اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دونوں پارٹیوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر مکمل غلبہ حاصل کر لے یعنی یا تو امریکہ جیت جائے اور پورے ملک پر غلبہ حاصل کر کے امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے اور یا پھر امریکہ شکست کھا کر اپنے اتحادیوں سمیت افغانستان سے نکل جائے۔ کئی برسوں کی جنگ کے بعد بھی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ اپنی تمام عسکری قوت اور سائنسی آلات تری کے باوجود افغانستان میں قدم نہیں جما سکا اور حامد کرزئی کی حکومت کابل کے نواحی علاقوں تک محدود ہے۔ نتیجے کے طور پر ہمارے سرحدی علاقے میدان جنگ بنے ہوئے ہیں۔ جنگجو دونوں طرف آتے جاتے اور اپنی پوزیشن بدلتے رہتے ہیں۔ امریکہ ہمارے سرحدی علاقوں کو جنگجوؤں کی نرسری سمجھتا ہے اس لئے وہ آزادی سے ان پر حملے کرتا رہتا ہے جس سے امریکہ کے خلاف نفرت کی آگ مزید بھڑکتی ہے اور اس کا فائدہ جنگجوؤں کو پہنچتا ہے۔ ہم نے ان دہشت گردوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے فانا، سوات اور دوسرے علاقوں میں آرمی آپریشن شروع کر رکھا ہے جس میں بے گناہ شہری بھی مارے جا رہے ہیں۔ جب فوج کے ہاتھوں جنگجوؤں اور دہشت گردوں کا ناٹھ بند ہوتا ہے، ان کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے تو وہ انتقام لینے کے لئے اسلام آباد، لاہور اور دوسرے شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ اس انتقامی کارروائی کے لئے ان کے پاس ایک ہی خوفناک ہتھیار ہے اور وہ ہے خودکش حملہ یا بم دھماکہ اور بدقسمتی سے یہ ایسی وارداتیں ہیں جن پر حکومت تمام تر وسائل کے باوجود قابو نہیں پاسکتی اور نہ ہی ان پر قابو پانا ممکن ہے۔ اس طرح کی وارداتیں تو لندن جیسے شہروں میں خون کی ندیاں بہا جاتی ہیں جہاں پولیس اور شہری چوکس ہیں اور ہر طرح کے جدید سائنسی آلات نصب کئے گئے ہیں۔

افغانستان کی گزشتہ ایک صدی کی تاریخ بے پناہ انقلابات، حکومتوں اور تختوں کے اٹھنے اور جنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ روس کے خلاف افغان جہاد ابھی کل کی بات ہے جس کے دوران روسی خفیہ ایجنسی ”کے جی بی“ پاکستان میں مختلف مقامات پر بم دھماکے کرائی رہی۔ جب مشرقی پنجاب میں سکھستان کی تحریک نے زور پکڑا تو انتقام کی پیاس بجھانے کے لئے ان بم دھماکوں میں ”را“ بھی شامل ہو گئی لیکن ہماری اصل خوش قسمتی یہ تھی کہ یہ ساری جنگیں، انقلابات اور جہاد افغانستان تک محدود رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری بدقسمتی کہ روس کے خلاف جہاد ختم ہونے کے بعد غیر ملکی جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد ہمارے سرحدی علاقوں میں قیام پزیر ہو گئی جن کی موجودگی کا لوٹس نہ لیا گیا اور نہ ہی حکومت نے انہیں ملک بدر کرنے کے لئے کوئی موثر حکمت عملی اپنائی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ لوگ پاکستان کے لئے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھے۔ اب تک صورتحال یہ ہے کہ جب سے فانا اور سرحدی علاقوں میں پاکستانی فوج نے آپریشن شروع کیا ہے، افغانستان کے مختلف علاقوں سے جنگجوؤں کی بڑی تعداد ان علاقوں میں پکڑ گئی ہے اور پاکستان کی فوج کے خلاف ہیرا آ رہا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر حامد کرزئی کی حکومت اور امریکی افواج پر دباؤ کم ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اس قدر تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس ہیں کہ پاکستانی فوج کو آگے بڑھنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ اسی کو میں حالات کا جبر کہتا ہوں کہ ایک طرف پاکستانی فوجی شہید ہو رہے ہیں اور ہمارے بے پناہ معصوم شہری مارے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف امریکہ ہوائی حملے کر رہا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ امریکہ اپنی اس پالیسی کو ہرگز ترک نہیں کرے گا بلکہ اپنی کارروائی میں تیزی لائے گا۔ تیسری طرف ہم دھماکوں اور خودکش حملوں کے سبب سارا ملک خوف و ہراس اور بے یقینی کی گرفت میں رہے گا جس سے معاشی بحران گھمبیر تر ہوتا چلا جائے گا۔ کم سے کم مجھے یہ دکھائی نہیں دیتا کہ ہم مستقبل قریب میں ان خطرات سے نکل سکیں گے البتہ یہ توقع کی جانی چاہئے کہ جب فوج فانا اور سارے سرحدی علاقوں کو جنگجوؤں سے پاک کر کے حکومتی رٹ بحال کر دے اور پھر اپنی سرحدوں کو کسی حد تک ”سیل“ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو شاید پاکستان میں کسی حد تک امن لوٹ آئے کیونکہ افغانستان کے ساتھ سرحدوں کو ”سیل“ کرنا نہایت مشکل کام ہے، کچھ تجزیہ نگاروں کے مطابق ناممکن ہے۔ ہماری اس اندرونی جنگی کیفیت سے ہمارے دشمن بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں بلوچستان میں علیحدگی کی تحریکوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ حکمرانوں نے ابھی تک بلوچستان سے معافی مانگنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا حالانکہ اس طرف بھی بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ گزشتہ دنوں کوئٹہ میں ایک دانشور اور اسٹنٹ پروفسر حسن کو گرفتار کر لیا گیا جس کے خلاف مجھے بہت سی ای میلیں موصول ہوئیں۔ خدا را۔ مشرقی پاکستان والی غلطیاں نہ دہرائیں۔ اگر پروفسر حسن نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے عدالت میں پیش کریں۔ دانشوروں، سیاسی کارکنوں، طلبہ اور پروفسروں کو عقوبت خانوں میں رکھنا نفرت کے انگارے بھڑکانے کا سامان ہوتا ہے۔ ہم جمہوری حکومت سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ نفرت کے انگارے بھڑکانے کی بجائے محبت کے گلاب کھلائے گی۔ کچھ حضرات کے نزدیک اس صورتحال کا حل امریکہ کو خدا حافظ کہنے میں مضمر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دریں حالات جب امریکہ ہمارے ملک میں بہت

سے سڑجھک مقامات پر موجود ہے، ہماری سیاست اور کنکرائی میں دخل ہو چکا ہے اور ہمارے سرحدی علاقوں پر منڈلا رہا ہے، ہم آسانی سے امریکہ سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ معاشی اور فوجی امداد کو چھوڑیے کہ ہم امن کے لئے یہ قیمت ادا کر سکتے ہیں لیکن کیا ہماری قیادت امریکی انتقام کا مقابلہ کر سکے گی؟ کیا اس وقت نام نہاد ”دارآں میرز“ سے الگ ہونا ممکن ہے؟ اس کے عالمی سطح پر کیا نتائج اور مضمرات ہوں گے؟ نعرے لگانے سے قبل ان تمام پہلوؤں کا تجزیہ ضروری ہے اور یہ تجزیہ شخصہ دل و دماغ سے کیا جانا چاہئے۔ باقی پھر انشاء اللہ!!



Print This Post



Email This Post

Posted in [Columns](#), [Dr. Safdar Mehmood](#) [No Comments »](#)

## Muqader Key Raaz

September 18th, 2008

## مقدّر کے راز

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے بیٹے محمد احمد کو اپنی خالہ کے سینے کے ساتھ سر لگا کر ایک طویل عرصے کے بعد محبت کی آغوش میں پناہ لینے دیکھ کر مجھے یک گونہ خوشی اور قلبی سکون حاصل ہوا۔ میں ہر روز اس خاندان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ ہم جیسے گوشہ نشینوں کے پاس دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دعا کا ایک حصہ قبول ہوا لیکن ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور اس کے باقی دو بچوں کے لئے ساری قوم کی دعائیں عرش بریں پر ہاتھ اٹھائے کھڑی ہیں۔ انہیں کب شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے، یہ صرف میرا رب ہی جانتا ہے۔

البتہ اس حوالے سے اخباری خبریں پڑھتے پڑھتے میں مزید الجھ گیا کیونکہ جب ڈاکٹر عافیہ کی گرفتاری کا راز فاش ہوا تھا اس وقت ہمیں بار بار یہ بتایا گیا تھا کہ انہیں اپنے تین بچوں سمیت 2003ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ امریکی حکومت کے نمائندوں کا کہنا تھا کہ ہم نے ڈاکٹر عافیہ کو جولائی 2008ء میں گرفتار کیا۔ اس سے قبل وہ کہاں تھیں ہمیں علم نہیں، اخبارات میں تو اسے آٹار ہا کہ وہ گزشتہ پانچ برسوں سے جیل میں ٹارچر کا نشانہ بنی ہوئی ہیں لیکن اب بتایا جا رہا ہے کہ محمد احمد ان کے بالک بیٹا ہے اور محمد احمد کے ڈاکٹر اور انجینئر والدین کشمیر کے زلزلے میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور اس وقت ڈاکٹر عافیہ نے اسے اپنی گود لے لیا تھا۔ کشمیر میں یہ زلزلہ اکتوبر 2005ء میں آیا تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد احمد کو بھی اسی سال یا 2006ء کے اوائل میں بیٹا بنایا گیا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گرفتاری بہر حال زلزلے کے بعد ہوئی ہے، چنانچہ یہ کونسا سال تھا اس سے صرف ڈاکٹر عافیہ کے خاندان کے لوگ ہی پردہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ صرف انہیں ہی علم ہے کہ وہ کس دن اپنے بچوں کے ساتھ کراچی سے اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئی تھی اور پھر واپس نہیں آئی اور کب ان کے گھر آئی ایس آئی کا کارندہ یہ پیغام دینے آیا تھا کہ اگر بیٹی اور اس کے بچوں کی زندگی مطلوب ہے تو منہ بند رکھیں۔ اس میں بہر حال کوئی شبہ نہیں کہ وہ امریکی حکومت کو مطلوب تھی۔ اسے ہماری آئی ایس آئی نے امریکی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے گرفتار یا اغوا کیا اور کابل پہنچایا۔ آخر وہ تخت سلیمانی پر بیٹھ کر یا ہوا کے دوش پر تو کابل نہیں پہنچی اور پھر اسے کابل جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب ہمارے خفیہ والوں کا کیا دھرا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اسے کابل لے جایا گیا تو یقیناً اس کے بچے بھی کابل گئے جن میں ایک معصوم بیٹا اور ایک نو عمر بیٹی بھی شامل ہے، اگر محمد احمد کابل میں بھی تھا تو دوسرے بچے بھی کابل ہی میں ہونا چاہئے۔ ہاں اگر امریکی حکومت ان کو ماں کے ساتھ امریکہ لے گئی ہے تو اس مسئلے کی تحقیق کی ضرورت ہے اور یہ تحقیق ہماری حکومت ہی کر سکتی ہے۔ اول تو حکومت اپنی خفیہ سے پوچھ سکتی ہے کہ ڈاکٹر عافیہ کے بچوں کو کس کے حوالے کیا گیا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح حکومت نے دلچسپی لے کر محمد احمد کی واپسی کا انتظام کیا ہے اسی طرح حکومت کو راز مزید دلچسپی لے کر اس کے دوسرے معصوم بچوں کا پتہ چلائے اور ان کی پاکستان واپسی کا انتظام کرے، اگرچہ وہ امریکی شہری ہیں لیکن اس وقت امریکہ انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس موقع پر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہیل ڈن حکومت پاکستان، وہیل ڈن وزارت خارجہ اور وہیل ڈن رحمان ملک۔ بس ذرا اسی طرح مزید دلچسپی لے کر عافیہ کی رہائی کا بندوبست کیجئے اور اس کے بچوں کا بھی پتہ چلائے۔ اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ قوم کی دعائیں بھی لیجئے۔

یقیناً کیجئے حکومت کو اس وقت قوم کی دعاؤں کی شدید ضرورت ہے، کیونکہ حکومت بظاہر دعاؤں سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ اسی خبر کے حوالے سے یہ انکشاف پڑھ کر میں گہری سوچ میں گم ہو گیا کہ مقدّر بھی انسانی زندگی میں نہایت اہم فیگور ہوتا ہے۔ میرے کئی دوست ان معاملات کو محض واقعات یا اتفاقات سمجھتے ہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ صرف اتفاقات نہیں ہوتے یہ مقدّر کا حصہ ہوتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ محمد احمد کے والدین انجینئر اور ڈاکٹر تھے، گویا نہایت پڑھا لکھا اور خوشحال گھرانہ تھا۔ خدا جانے محمد احمد کے کتنے بھائی اور بہنیں اور تھیں۔ بہر حال زلزلہ آیا اور یہ بچہ یتیم ہو گیا۔ اسے ایک نہایت پڑھی لکھی، دردمند اور خوف خدا رکھنے والی خاتون نے اپنا بیٹا بنالیا۔ نہ جانے اس کے دوسرے بہن بھائی کن خاندانوں کا حصہ بنے۔ والدین سے محرومی اور یتیمی کا زخم بھری رہا تھا کہ وہ اپنی دوسری ماں کے ساتھ سات آٹھ سال کی عمر میں قیدی بن گیا۔ یہ عمر سکول جانے، پڑھنے اور کھیلنے کی ہوتی ہے، یہ عمر بے فکری اور لڑکھن کی ہوتی ہے لیکن محمد احمد نے یہ عمر جیل خانوں اور ٹارچر سیلوں میں گزاری۔ اپنے سامنے اپنی دوسری ماں کو گرفتار ہوتے اور جسمانی تشدد کا نشانہ بننے دیکھا۔ دوسرے بہن بھائیوں کو پھنچڑتے دیکھا۔ یقیناً یہ اس کے لئے دوسرا زلزلہ تھا۔ گویا اس نے آٹھ نو سال کی زندگی تک دو زلزلے دیکھ لئے اور دو زلزلوں کا غم اٹھالیا۔ کیا یہ محض اتفاق ہی تھا؟

ڈاکٹر عافیہ صدیقی ایک نہایت پڑھی لکھی خاتون ہے اور اعلیٰ درجے کی امریکی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ہے۔ اس کی کلاس فیلوز کا کہنا ہے کہ وہ خوش مزاج، خاموش طبع اور نرم و نازک لڑکی تھی جو کسی طرح بھی دہشت گردی میں ملوث نہیں ہو سکتی اور نہ ہی امریکی فوجی سے بندوق چھین کر اس پر حملہ کر سکتی ہے۔ یہ مقدّر کا کھیل تھا کہ اس کی شادی نائن الیون کے اہم کردار شیخ خالد کے بھانجے سے ہوئی جو خود بھی اس وقت گوانتانامو بے کے بدنام زمانہ غلو بیت خانے میں امریکی ٹارچر کا نشانہ بنا ہوا ہے، اگر اسکی شادی کہیں اور ہوئی ہوتی تو وہ کبھی بھی جیل کی شکل نہ دیکھتی۔ انسانی زندگی کا ہر پہلو اپنے اندر سنگتوں راز چھپائے پھرتا ہے۔ مقدّر انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ بے شک انسان اشرف المخلوقات ہے وہ ہمت، محنت اور ارادے سے کوہ ہمالیہ بھی سر کر لیتا ہے اور سمندروں کے رخ بھی موڑ دیتا ہے لیکن کبھی وہ تمام تر صلاحیتوں کے باوجود مقدّر کے ہاتھوں مجبور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی کوششیں فرض ہے اور یہی اشرف المخلوقات ہونے کا تقاضا ہے لیکن نتیجہ پھر بھی اپنے ہاتھوں میں نہیں ہوتا اور یہیں سے مقدّر کا کھیل شروع ہوتا ہے۔



Print This Post



Email This Post

Posted in Columns, Dr. Safdar Mehmood No Comments »

Kam Se Kam Itna Tu Kigiye

September 16th, 2008



## کم سے کم اتنا تو کیجئے

صبح بخیر..... ڈاکٹر صفدر محمود

بی بی سی کے پروگرام میں پاکستان پر طنزیہ فقروں کے تیر چلتے ہوئے سن کر مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا۔ آپ نے بھی پڑھا ہوگا یا سن لیا ہوگا کہ بی بی سی نے ہمارے وزیر دفاع چودھری احمد علی کے غیر مزاحمتی بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر آج گاندھی جی زندہ ہوتے تو چودھری صاحب کا ماتھا چوم لیتے کیونکہ چودھری صاحب نے گاندھی جی کے غیر مزاحمتی (Non Violence) فلسفے کی لاج رکھ لی ہے اور امریکی حملوں کے خلاف امن کے ذریعے جنگ لڑنے کے ارادے کا اظہار کیا ہے۔ گاندھی جی کو ہمیشہ یہی گلہ رہتا تھا کہ مسلمان لڑاکے ہیں۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ نہ جانے اچھے بھلے امن پسند ہندو کو اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے ہی کیا ہو جاتا ہے کہ وہ لڑنے مارنے پر تیار ہو جاتا ہے اور بزدل سے بہادر بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر آج گاندھی جی زندہ ہوتے تو یقیناً بہت خوش ہوتے کہ ماشاء اللہ مسلمان کس قدر امن پسند ہو گئے ہیں کہ جب ان کے ملک پر حملے ہوتے ہیں اور ان کے شہری مرتے ہیں تو ان کا وزیر دفاع صاحب جواباً کہتا ہے کہ ہم تلوار سے نہیں بلکہ امن سے اپنا دفاع کریں گے۔ چنانچہ اسی امن کے فلسفے پر عمل کر کے وہ ہر روز اپنے شہریوں کو مرمور ہے ہیں اور قوم کے حوصلے پست کر رہے ہیں۔

بلاشبہ گاندھی جی غیر مزاحمتی فلسفے کے پرچارک تھے اور اس حوالے سے ایک واقعہ کا ذکر نہ ہی صرف مولانا ابوالکلام نے اپنی کتاب میں کیا ہے بلکہ اس کا ذکر اور بھی بہت سی کتابوں میں ملتا ہے۔ آپ کو علم ہے کہ جنگ عظیم دوم کے دوران لندن پر ہوائی حملے ہو رہے تھے جن کے نتیجے کے طور پر جانی و مالی نقصان ہو رہا تھا۔ ہندوستان کا انگریز وائسرائے ہندوستانی قائدین پر جنگ میں مدد کے لئے دباؤ ڈال رہا تھا۔ انہی دنوں گاندھی جی وائسرائے سے ملنے گئے تو وائسرائے نے ان سے مدد کی اپیل کی۔ اس کے جواب میں گاندھی جی نے کہا کہ براہ کرم حکومت برطانیہ کو میرا یہ پیغام پہنچادیں کہ وہ جنگی جارحیت کا مقابلہ روحانیت سے کریں۔ وائسرائے ہکا بکا رہ گیا اور پوچھنے لگا کہ وہ کس طرح؟ گاندھی جی کا جواب تھا کہ آپ ذرہ بھر بھی مزاحمت نہ کریں، دشمن خود ہی شک آکر حملے کرنا چھوڑ دے گا۔ وائسرائے نے دل میں سوچا کہ گاندھی جی کس قدر شاندار مشورہ دے رہے ہیں اور اس مرض کا کتنا تیر بہدف نسخہ تجویز کر رہے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ اس روحانی علاج کے دوران دشمن لندن کو خاک و راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔ ابوالکلام سمیت سارے مصنفین نے لکھا ہے کہ وائسرائے یہ مشورہ سن کر اس قدر یوگھلا یا اور گھبرایا کہ جب گاندھی جی انھیں کہہ جانے لگے تو وہ کرسی سے اٹھ کر انہیں رخصت کرنا ہی بھول گیا حتیٰ کہ وہ گھنٹی بجانا بھی بھول گیا جو کہ ان ملاقاتوں کے معمول کا حصہ تھا۔ دراصل وائسرائے ایسے مواقع پر اپنی میز کے ساتھ لگا ہوا گھنٹی کا بٹن دبا دیا کرتا تھا۔ گھنٹی اس کے سیکرٹری کے کمرے میں بجتی تھی۔ سیکرٹری وائسرائے کے کمرے میں آکر مہمان کو باہر لے آتا تھا اور اسے وائسرائے کی جانب سے رخصت کرتا تھا۔ اس روز گھبراہٹ میں وائسرائے گھنٹی کا بٹن دبانے بھول گیا چنانچہ گاندھی جی اکیلے ہی باہر نکلے اور اپنی گاڑی ڈھونڈ کر خود ہی رخصت ہو گئے۔ ویسے اس طرح کے مشوروں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

بی بی سی جب ہمارے ”وزیر غیر دفاع“ کے بیان پر طنز کے نشتر چلا رہا تھا تو اس کا اشارہ گاندھی جی کے اسی مشورے کی جانب تھا کیونکہ آج کل پاکستان بھی اپنا دفاع روحانیت کے ذریعے ہی کر رہا ہے اور گاندھی جی کے راستے پر چلتے ہوئے ہمارے وزیر دفاع صاحب امن سے جارحیت کا جواب دینے کا اعلان کر رہے ہیں اسی لئے میں اپنے وزیر دفاع صاحب کو وزیر غیر دفاع کہتا ہوں کیونکہ دنیا میں کبھی بھی جارحیت کا جواب ”ممنوں تروں“ — قدم پوی اور وفاداری سے نہیں دیا جاتا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر قوم کو بھوکا تنگ کر دیا کہ دفاع پر کھربوں روپے لگانے کا کیا تنگ ہے۔ اور ایک عدد وزارت دفاع پالنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اس وزارت کا نام ”جی آئی اے نوں“ رکھ دیں جس کا انگریزی ترجمہ ہوگا Welcome You Are Most — ویسے میں الطاف بھائی کا خطاب سن کر اس صورت حال کا سارا الزام چودھری احمد علی کو بھی نہیں دیتا کیونکہ ہماری وزارت دفاع نے دکھانے کے لئے اپنے ایف 16 طیارے وزیرستان کی فضاؤں میں بھیجے تھے اور بڑی بڑی خبریں لگوا دی تھیں تو امریکہ نے پاکستان کو دیے گئے ایف 16 طیاروں کے جواب میں ایف 18 بھیجا دیے۔ اب اس میں پتہ چل رہا ہے چودھری صاحب کیا کریں کیونکہ ایف 18 بڑا خوفناک طیارہ ہے۔ ویسے امریکہ یہ طیارہ ہندوستان کو بھی دے چکا ہے۔ خدا خواستہ کل کلاں ہندوستان نے اس طیارے کا انکار کر دیا تو چودھری صاحب کیا کریں گے؟ بہر حال اس میں ایک اچھی چیز رفت یہ ہے کہ جب ہمارے طیارے جاتے ہیں تو امریکی طیارے بھاگ جاتے ہیں جس سے ہمیں شاندار سرخیاں لگانے کا موقع مل جاتا ہے اور جب ہمارے طیارے واپس آ جاتے ہیں تو امریکی طیارے اپنا کام کرنے لگتے ہیں۔ امید ہے کہ اسی طرح کامیابی سے یہ آنکھ پھولی کا کھیل جاری رہے گا اور چودھری صاحب کے امن کے فلسفے کو گزند نہیں پہنچے گا کیونکہ امریکہ کو لاکھوں کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے اس کے لئے بڑی قومی غیرت و حمیت درکار ہے جس سے غلام ابن غلام قوم میں محروم ہوتی ہیں ورنہ امریکہ کے قریب واقع دو مالک بولیو یا اور وینزویلا نے نہ ہی صرف امریکہ سے اپنے سفیر بلا لئے ہیں بلکہ احتجاج کے طور پر امریکہ کے سفیروں کو بھی دیس نکالا دے دیا ہے لیکن ہماری حکومت یہ رسک بھی نہیں لے گی کیونکہ اگر ہماری حکومت واشنگٹن میں تعینات اپنے سفیر حسین تھانی کو واپس بھی بلا لے تو وہ واپس نہیں آئیں گے۔ اس کی وجہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ مختصر یہ کہ جب پالیسی ساز اداروں میں ایجنٹ بھرے ہوں تو پھر جارحیت کا جواب صرف امن کے ذریعے ہی دیا جاسکتا ہے۔

چلئے امریکہ کے حملوں کا جواب آپ نہیں دے سکتے تو نہ نتیجے لیکن اپنی پارلیمنٹ کی پاس کردہ قراردادوں کا بھرم رکھنے کے لئے اور قوم کو تپلی دینے کے لئے کچھ تو کیجئے کیونکہ جب امریکی حملے ہمارے صدر، وزیر اعظم اور آرمی چیف کے بیانات کا مذاق اڑائیں تو ہم پر کچھ نہ کچھ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ برگزما امت یا جوابی کارروائی کرنا انور نہیں کر سکتے تو نہ کیجئے لیکن آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ امریکی اور نیو فورسز کی سپلائی بذریعہ پاکستان فقط چند روز کے لئے معطل کر دیں اور یہ کارروائی کرنے سے قبل امریکی حکومت کو باقاعدہ وارننگ دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے



ہوش بھکانے آجائیں گے۔ دوم یہ کہ امریکہ پر واضح کر دیں کہ اگر آپ نے یونہی پاکستان پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا تو ہم سرحدی علاقوں میں جاری آرمی آپریشن بند کر دیں گے جو ہم نے امریکہ کے حکم پر شروع کیا ہے اور جس میں ہمارے پناہ جانی و مالی نقصان ہو رہا ہے۔ تیسری آپشن یہ بھی ہے کہ آپ بین الاقوامی برادری کی حمایت حاصل کریں، سکیورٹی کونسل کا اجلاس بلائے کی تجویز دیں اور امریکہ پر دباؤ بڑھائیں۔ بین الاقوامی رائے عامہ ڈپلومیسی کا موثر ہتھیار ہوتی ہے۔

اگر ان میں سے کوئی تجویز بھی آپ کے لئے قابل قبول نہیں تو پھر گاندھی جی کے غیر مزاحمتی فلسفے پر عمل کرتے ہوئے ایک کام کریں۔ وزیرستان کے لوگوں کو مشورہ دیں کہ جب ان کی فضا میں امریکی طیارے نمودار ہوں تو وہ باہر نکل آیا کریں اور میدانوں میں کھڑے ہو کر طیاروں کو جو تے لہرائیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے اول تو جو توں کی سیل بڑھ جائے گی دوم گاندھی جی کی روح خوش ہو جائے گی، سوم احتجاج کی بھاپ بھی نکل جائے گی لیکن مجھے خدشہ ہے کہ چوہدری احمد مختار اس معصوم احتجاج کو بھی شرف قبولیت نہیں بخشیں گے کیونکہ جن قوتوں کی خوشامد کر کے اقتدار حاصل کیا جائے ان کو آنکھیں دکھانا ممکن نہیں ہوتا اور آقا کے کھوں کا جواب سر تسلیم خم کر کے ہی دیا جاتا ہے۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج ”آقا“ میں آئے



Print This Post



Email This Post

Posted in **Columns, Dr. Safdar Mehmood** No Comments »

Page 1 of 3112345678»...Last »